(2) حیدر علی آتش

(۱۷۶۴ء۔۱۸۴۶ء)

تعارف: طرزِ مرصع اور دبستان لکھنو کے نمائندہ شاعر خواجہ حیدر علی آتش ۱۷۶۴ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی بخش تھا جو شجاع الدولہ کے دور میں فیض آباد آئے تھے۔ حالاں کہ ان کے بزرگ بغداد کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں والدِ ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس کی وجہ سے طبیعت میں شوریدہ سری آ گئی۔ آتش حسن کا پورا ادراک رکھتے ہیں اور سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ لکھنو کے انحطاط پذیر معاشرہ نے ان کے وقت تک گدلے پانی ایسی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن آتش اس ماحول میں بھی کنول کے پھول کی طرح پاکیزگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ اپنے ادبی ترکے میں دو دیوان چھوڑے ہیں۔ کلام میں قناعت، شکوہِ الفاظ اور رجائی پہلو زیادہ ہے۔ لوگ انھیں لکھنوی شاعر کہتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو دبستان لکھنو اور دلی کے سنگم پر کھڑے ملتے ہیں۔

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

۱۸۴۶ء میں راہی عدم ہوئے۔

غزل (1)

شعر نمبر 1 خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے ہوائے دورِ مئے خوش گوار راہ میں ہے

(بہاول پور 08، ڈیرہ غازی خاں 10)

حل لغت: چمن: باغ خزاں: پت جھڑ کا موسم خوش گوار: اچھی، لذیذ مئے: شراب دور: گردش
راہ میں ہے: راستے میں ہے ہوائے دورِ مئے خوش گوار: لذت بھری شراب سے مہکی ہوئی ہوا

مفہوم: خوش ذائقہ شراب سے مہکی ہوئی ہوا آ رہی ہے جو اس بات کی پیامبر ہے کہ باغ سے خزاں رخصت ہونے کو ہے اور بہار جلد ہی آنے کو ہے۔

تشریح:

دبستان لکھنؤ میں بلند مقام کے حامل شاعر جنھیں بڑے بڑے شعرا کا اُستاد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ اپنے مخصوص طرزِ فکر کو عام کرتے ہوئے دعوتِ فکر دکھائی دیتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں انھوں نے خزاں اور بہار کا چمن کے حوالے سے تذکرہ کیا ہے۔ بہار کا موسم خوشیوں کا پیامبر ہوتا ہے۔ چمن کی ہر شے جوبن پر ہوتی ہے۔ رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دل فریب سماں پیش کرتا ہے۔ اس موسم میں پرندے گلوں کا طواف کرتے ہیں اور انسان چمن کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خزاں کا موسم اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ پھول ندارد، درختوں کا سبز لباس، زرد لباس میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ہریالی کا نام و نشان ہی مٹ جاتا ہے اور دوسرے الفاظ میں باغ سے چہل پہل اور رونق غائب ہو جاتی ہے۔ اس موسم میں نہ تو پرندے باغ کا رُخ کرتے ہیں، نہ ہی انسان باغ کو قابلِ دید گردانتے ہیں۔ لہٰذا صرف انسان ہی نہیں چرند پرند بھی بہار کے متمنی ہوتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں شاعر نے پیش گوئی کی ہے کہ بہار کا موسم جلد آنے کو ہے اور خزاں رخصت ہونے کو ہے۔ اس پیش گوئی کا انھوں نے پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ ہوا سے ہلکی ہلکی مگر فرحت بخش مہک آنا شروع ہو گئی ہے ایسی مہک جو شراب کے دور

کے چلنے سے محفل میں پھیل جاتی ہے۔ اور یہ مہک اس بات کی عکاس ہے کہ جلد ہی بہار آنے کو ہے۔ بقول شاعر:

خوش بو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اُس کا سراغ ہے

دراصل بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ پھول کی پتیوں سے خوش بو پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ خوش بو ہوا کو معطر کر دیتی ہے۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ یہ معطر ہوا جب باغ میں پہنچے گی تو باغ میں اس معطر ہوا میں ٹہلنے کا ایسا ہی مزا آئے گا جیسے کسی شراب کے جام نوش کرنے اور پھر اس سے پیدا ہونے والے خمار کی کیفیت سے۔ بقول میر تقی میر:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادوباراں ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آتش نے استعاروں کے پردے میں وطن کے متعلق پیش گوئی کی ہو۔ کیوں کہ خزاں کو اکثر اوقات مایوسیوں، نا امیدیوں، غموں اور دکھوں کی علامت قرار دیا جاتا ہے تو بہار کو مسرتوں، ولولوں، دکھوں سے چھٹکارے اور تندرستی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اسی امر کا آتش ایک دوسری جگہ یوں اظہار کرتے ہیں کہ:

آئے بہار جائے خزاں، ہو چمن درست
بیمار سال بھر کے نظر آئیں تندرست

آتش کا دور انتہائی طوائف الملوکی کا دور تھا۔ مسلمان ایک طرف تو مکار انگریزوں کے شکنجے میں پھنس چکے تھے۔ دوسری طرف متعصب ہندو اُس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ خونِ مسلم نہایت ارزاں ہو چکا تھا۔ چناں چہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آتش نے مسلمانوں کے لیے پیش گوئی کی ہے کہ موسم خزاں (دکھوں اور غلامی کا دور) ختم ہونے کو ہے اور موسم بہار (خوشی کا دور، دورِ آزادی) جلد آنے کو ہے اور پھر مسلمانوں کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ اس لیے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ جلد ہی آفتابِ آزادی والی صبح طلوع ہو گی۔ بقول شاعر:

حق کی جیت رہی ہمیشہ باطل کو ہوتی ہے مات
آخر کو تو کٹ جاتی ہے جتنی بھی ہو لمبی رات

شعر 2: عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

(بہاولپور 08، ڈیرہ غازی خاں 10 ملتان 2006,09، گوجرانوالہ 2012ء)

حل لغت: عدم: مقام فنا، موت کے بعد کی دنیا — کوچ: روانگی — ہستی: زندگی — دیار: علاقہ، شہر، مقام

مفہوم: انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں ہی سفرِ آخرت کی تیاری کرے کیونکہ اس سفر کے دوران کوئی شہر یا بستی نہیں آتی۔

تشریح:

اس دنیا میں انسان کی حیثیت ایک مسافر کی مانند ہے۔ وہ ایک ایسا مسافر ہے جو عالمِ ارواح سے ہوتا ہوا عالمِ فنا میں آیا ہے۔ اور اس مقام (عالم فنا، دنیا) پر چند دن گزارنے کے بعد وہ عالمِ برزخ میں جا پہنچے گا۔ اور پھر کائنات کے فنا ہونے کے بعد عالمِ برزخ سے اُسے آخرت میں جانا پڑے گا۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان ایک ایسا مسافر ہے، جو مختلف مسافتیں طے کرتا ہوا جانبِ منزل رواں دواں ہے اور یہ منزل آخرت ہے۔ کسی بھی مسافر کے لیے لازم ہوتا ہے کہ سفر کے لیے زادِ راہ اکٹھا کرے یا پھر ایسا سامان اکٹھا کرے جو اُسے سفر کے دوران اور منزل پر کام آ سکے۔ یہ زادِ راہ اُسے دورانِ سفر کام آتا ہے تاکہ اُسے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ قدیم زمانے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ قافلوں کے وہ مسافر جو سفر کے لیے زادِ راہ لے جاتے وہ آسانی سے منزل پر پہنچ جاتے اور سفر کی دشواریاں بھی کم ہو جاتیں۔ لیکن وہ مسافر جو غفلت برتتے اور زادِ راہ کم لیتے یا نہ لیتے وہ منزل تک نہ پہنچتے اور ناکام لوٹ آتے تھے۔

چناں چہ انسان جو کہ مسافر ہے کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے سفر آخرت کے لیے زادِ راہ اکٹھا کرے تاکہ وہ یہ سفر کامیابی سے طے کرتا ہوا آخرت میں بھی سرخرو ہو سکے اور یہ زادِ راہ آخرت کیا ہے؟" بقول شاعر

پیش ہے تجھ کو سفر، زادِ سفر پیدا کر
آخرت میں نیک عمل ہی کام آئیں گے

تشریح طلب شعر میں شاعر اسی سفر آخرت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کو آخرت کی اس دنیا کی فکر اور تیاری کرنی چاہیے کیوں کہ یہ دنیا دار العمل ہے۔ انسان کے اعمال ہی اُس کا زادِ راہ ہیں۔ جو شخص اچھے اعمال لے کر جائے گا وہ کامیابی سے منزل مقصود پالے گا۔ ورنہ برعکس معاملے میں دوزخ کے آتش دان میں اُسے پھینک دیا جائے گا۔ اس دنیا میں انسان جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی صلہ پائے گا۔ ارشادِ نبوی ہے "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"

اسی لیے شاعر نے کہا ہے کہ جیتے جی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ انسان دنیا ہی میں مگن رہتا ہے وہ اپنی مسافر کی حیثیت کو بھول کر اپنے آپ کو ابدی مکین سمجھنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کے جسم سے روح کھینچ لی جاتی ہے اور پھر وہ پچھتاتا ہے۔ لہٰذا شاعر نے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ موت سے پہلے ہی اچھے اعمال کیے جائیں تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔ بقول شاعر:

جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل
مسافر شب سے اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

شاعر مزید بتاتا ہے کہ اس سفر کی نوعیت دنیاوی سفر سے کہیں مختلف ہے۔ یہاں یہ کیفیت نہیں کہ آپ راستے میں کسی شہر یا علاقے میں ٹھہر کر کوئی سامان اور اشیائے ضرورت خرید لیں۔ ہرگز نہیں بلکہ یہاں کوئی شہر اور علاقہ راستے میں نہیں پڑتا۔ آپ صرف اُسی زادِ راہ سے مستفید ہو سکتے ہیں جو آپ نے پہلے ہی اکٹھا کر لیا ہو یعنی دنیا ہی کے اعمال کام آئیں گے۔ روزِ قیامت گناہ گار لوگ اللہ سے التجا کریں گے کہ اے اللہ ہمیں اب ایک مرتبہ دنیا میں بھیج دے، ہم ایک ایک لمحہ تیری عبادت کریں گے اور ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے، لیکن اُن کی درخواست رد کر دی جائے گی اور کہا جائے گا اب وقت گزر چکا ہے۔

شعر 3

فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے

(بہاولپور 08، ڈی جی خان 10 ملتان 06،07،09، گوجرانوالہ 2012ء)

حل لغت: بدرقہ: راہنما، محافظ، راہبر — رفیق: دوست — عنایت پروردگار: اللہ کی مہربانی

مفہوم: موت کے سفر میں ہمارے ساتھ نہ کوئی دوست ہوگا نہ کوئی راہنما، صرف اللہ کی مہربانی ہوگی جو کام آسکے گی۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے ایک اور حقیقت کے متعلق قلم کشائی کی ہے اور یہ شعر پہلے شعر سے ہی متعلق (Relevant) ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ قافلوں کی شکل میں سفر کرتے تھے اور بہت لمبے سفر پر شاذ و نادر ہی کوئی اکیلا جاتا، کافی لوگوں کی جمعیت اکٹھے ہو کر جاتی اور اس سفر میں اُسے رہبر مقرر کر لیا جاتا جو اس منزل سے واقف ہوتا، جس نے پہلے یہ سفر طے کیا ہوا ہوتا اور سارا قافلہ اُس رہبر کی سربراہی میں منزل کی جانب رواں دواں ہوتا تھا۔ کئی دوستوں کے اکٹھے سفر کرنے سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے تھے۔ اول تو مسافروں کے دلوں سے راستے کی مصیبتوں کا خوف کم ہو جاتا تھا۔ لوٹ مار کے امکان بھی کم ہوتے تھے، سفر بھی آسانی سے کٹ جاتا تھا اور پھر رہبر کی وجہ سے باآسانی منزل پر پہنچ جاتے۔ اسی لیے کسی بھی مسافر کی خواہش ہوتی کہ وہ اکیلے سفر کرنے کی بجائے دو تین اپنے ہم سفر ساتھ لیتا چلے۔

یہ تو ہے دنیاوی سفر کی نوعیت۔ لیکن آخرت کے سفر کی نوعیت اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ یہ سفر جو آفرینش بنی آدم سے جاری ہے اور انتہائے بنی آدم تک جاری رہے گا، بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی رہبر اور ہمدرد ملتا ہے جو اس سفر میں رہنما کے

طور پر خدمات انجام دے اور نہ ہی کوئی دوست احباب انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ بلکہ اُسے یہ سفر بالکل تن تنہا طے کرنا پڑتا ہے۔ عزیز و رشتہ دار اور دوست تو فقط اتنا کرتے ہیں کہ بے نور اندھی گور میں منوں مٹی تلے انسان کو چھوڑ جاتے ہیں۔ بقول شاعر:

راہ فنا میں برق کس نے دیا کسی کا ساتھ
پہنچا کے دوست قبر تک سارے چلے گئے

چناں چہ اس سفر میں رہنما و احباب غیر حاضر ہوتے ہیں کوئی دوسرا انسان کی مدد کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان کے کچھ کام آتا ہے تو وہ ہے فقط رب ذوالجلال کی رحمت۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی اس سفر میں مسافر کے لیے آسانی پیدا کر سکتی ہے کیوں کہ جب انسان تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے تو رحمتِ الٰہی اُسے پناہ دیتی ہے۔ بقول اقبالؒ:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو، تیرے عفوِ بندہ نواز میں

صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات انسان کے اس سفر کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ یا پھر اگر اللہ کو اُس کے اعمال پسند ہوں تو وہ بھی اس کا وسیلہ بن سکتے ہیں، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر اللہ انسانی اعمال کے لحاظ سے انصاف کرے تو یہ ناممکن بات ہے کہ اُس کے اعمال اُسے بخشوا سکیں۔ لیکن پھر بھی وہ خدائے لم یزل اور غفور و رحیم ہے وہ خطاؤں کو بخش کر انسان کے اس اُخروی سفر کو کامیاب بنانے پر قادر ہے اور بناتا بھی ہے۔

پردہ مری خطاؤں پہ ڈالا ہے پیار کا
مجھ پہ بڑا کرم ہے مرے پردہ دار کا

شعر 4

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار، راہ میں ہے

(ملتان 06,07,09، گوجرانوالہ 2012ء)

حلِ لغت:

بہتیرے: بہت زیادہ	مسافر نواز: مسافروں پر مہربانی کرنے والا
ہزار ہا: بہت زیادہ / ہزاروں	شجرِ سایہ دار: سایہ فراہم کرنیوالے درخت

مفہوم: انسان کے لیے لازم ہے کہ سفر اختیار کرے اُسے راستے میں ہزار ہا مددگار اور سایہ دار درخت ملیں گے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں حیدر علی آتش انسان کو سفر کی ترغیب دے رہے ہیں۔ عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ "السفر وسیلۃ الظفر" سفر کامیابی کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ سفر کا عزمِ صمیم لے کر گھر سے نکلتے ہیں راستے کے مصائب برداشت کرتے ہیں، سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور ہمت، کوشش اور لگن سے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، ایسے ہی لوگ منزل مقصود کو پا لیتے ہیں۔ بقول شاعر:

منزل کا مستحق وہی صحرا نورد ہے
چلتا رہے جو آبلہ پائی کے باوجود

تجھے مل جائیں گے راہ میں ہزاروں ساتھ چلنے کو
خدا کے اک بھروسے پر نکل کر دیکھ تو گھر سے

برعکس اس کے وہ لوگ جو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے سے دل برداشتہ ہو کر سفر ترک کر دیتے ہیں، وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے۔ گویا انسان جس قدر ہمت و حوصلے سے کام لیتا ہے اُسی قدر کامیابی پاتا ہے۔ اسی امر کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: "انسان کے لیے کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے"

شاعر نے بھی اسی بات کی ترغیب دی ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی سے سفر کرنا شرط ہے اور جو اس شرط پر پورا اترے گا وہ جلد یا بدیر ضرور منزل پا لے گا۔ ضرورت صرف صحیح نیت اور جدوجہد کی ہے۔ جب نیت میں فتور پیدا ہو جائے تو ایک چھوٹا

سا کام بھی کوہِ گراں بن جاتا ہے اور جب ارادے مضبوط ہوں تو کوہِ گراں روئی کے گالے بن جاتے ہیں۔

رُکے جو لوگ تو اِک آبجو بھی دریا تھی　　　اتر گئے تو سمندر بھی تا کمر نکلے

شاعر مزید کہتا ہے کہ اس خیال سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں کہ مسافر تنہا ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ ایسے ہزارہا لوگ ہیں جو مسافر کی خاطر مدارات اور مدد میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ ایسے ہزار ہا شجر سایہ دار ہیں جو مسافر کے لیے ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتے ہیں، ایسے سینکڑوں اشجار ہیں جو مسافر کے لیے ذریعہ سرور و سکون ہیں۔ اس طرح مسافر آسانی سے منزل حاصل کر لیتا ہے اور اُس کی منزلیں سمٹ جاتی ہیں۔ بقول ایوب اختر:

چھو ہی لیتے ہیں منزل کو آخر قدم　　　کٹ ہی جاتا ہے یارو بھی کا سفر

جہاں تک شجرِ سایہ دار کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ایک مسافر کو ہزاروں مددگار میسر آ جاتے ہیں۔ قبیلۂ طے کا سردار حاتم طائی جس کی داستانیں آج افسانوی رنگ اختیار کر چکی ہیں۔ گو اُس کے کارنامے آج بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اور بعض جھوٹے قصے بھی اُس کے ساتھ منسوب کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی فی الحقیقت وہ بڑا سخی اور ایک عزمِ صمیم کا حامل مسافر تھا۔ ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ دورانِ سفر منزل کی تلاش میں پرندوں نے اُس کی مدد کی۔ پھر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں ہی کی مثال لے لیجیے۔ عرب کے صحرا سے نکل کر ساری دنیا کا سفر کیا اور اس سفر کے نتیجے میں کامیابی حاصل ہوئی اور وہ عروج حاصل ہوا کہ آفرینشِ عالم سے چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی دیکھے گی۔

شعر 5　　مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے　　　خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

حل لغت:　مقام: منزل

مفہوم:　اگرچہ ہمارے راستے میں ہزاروں دشمن موجود ہیں مگر خدا تو ہمارا حامی و ناصر ہے۔ لہٰذا ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

تشریح:

یہ صحیح ہے کہ سفر کامیابی کا ذریعہ ہے۔ تاہم مسافر بننا اور پھر اس سفر کو ثابت قدمی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سفر کرنا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ قدم قدم پر مصائب مسافر کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ مسافت کی کوفت اور سفر کا خوف ہمہ وقت اُس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ مال و اموال کے لٹنے کا ڈر بھی اُس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اور چور اور ڈاکو مسافروں کو تہی دست کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ پھر سفر کی تھکاوٹ، بے آرامی اور بے سکونی جسمانی طور پر اُس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پردیس میں ہونے کی وجہ سے گھر اور رشتہ داروں کی دوری اُسے الگ ستا رہی ہوتی ہے۔

لیکن شاعر تمام خوف اور نقصانات سے پہلو تہی کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ سچے اور پُرعزم مسافر کو ان مصائب سے گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اگر یہ تمام مصائب اُس کے سفر کی مخالفت میں کمر بستہ ہیں تو خدا تو اس سفر میں اُس کا حامی و ناصر ہے اور نصرت خداوندی کے سامنے ان مصائب کی کیا حیثیت ہے۔ بقول شاعر:

ہو بھرا شہر بھی دشمن تو مجھے کیا غم ہے　　　چاہیے ساتھ مرے صرف خدا کی رحمت

ایسے ہی راہِ حق کے متلاشیوں کو خود اللہ تعالیٰ منزلِ مقصود کی طرف گامزن کر دیتا ہے۔ گویا تلاشِ منزل میں ان مسافروں کا رہبر و رہنما اللہ ہوتا ہے۔ اور پھر جس مسافر کا رہبر اور مددگار اللہ ہو تو دنیاوی دشمنوں اور مصائب کی اُس کے سامنے کیا وقعت۔

ارشادِ ربانی ہے۔ "جولوگ ہمارے حق میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے لیے کامیابی کے راستے کھول دیتے ہیں"
ترجمہ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے پھر مسافتیں سمٹ جاتی ہیں۔ بقولِ شاعر:

مسلسل چل رہا ہوں، آ رہا ہوں ــــ ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل

ہے اگر تجھ کو یقین، فضلِ خدا ہو جائے گا ــــ کود پڑ دریا میں، کیا طوفان کا غم، کشتی کی فکر

دراصل آتش انسان میں حوصلہ، ولولہ اور اس میں سفر کا جوش پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ جمود کے حصار کو توڑ کر وہ عازمِ سفر ہو جائے اور پھر اُسے منزل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ شاعر کہتا ہے کہ مسافروں کو جگہ جگہ کے مصائب، مخالفتوں اور شیطانی قوتوں سے خوف کھا کر حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے کیوں کہ خدا اُن کا مددگار ہے۔ اور اللہ کی مدد کے سامنے دنیا کی تمام طاقتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ فرمانِ الٰہی عزوجل ہے کہ ساری دنیا مل کر اگر کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے مگر اللہ نہ چاہے تو اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور اگر ساری دنیا مل کر کسی کو نقصان پہنچانا چاہے اور اللہ نہ چاہے تو وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے مسافر کو گھبرانا نہیں چاہیے جب وہ سفر کے لیے کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوگی اور وہ لازمی طور پر منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگا۔

شعر 6- گُل مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے ــــ تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش

حل لغت: سر کے بل: سر کے سہارے چلنا ــــ گُلِ مراد: تمنا کا پھول، منزل ــــ خار: کانٹے

مفہوم: اے آتش! اگر سفر میں تیرے پاؤں تھک جائیں تو سر کے سہارے چلنا شروع کر دے۔ اگر راہ میں مصائب ہیں تو کیا، منزل بھی تو منتظر ہے۔

تشریح:

یہ شعر غزل کا مقطع ہے۔ تشریح طلب شعر میں آتش کہتے ہیں کہ انسان کو سفر کے مصائب اور تکالیف سے پہلو تہی کرتے ہوئے سفر جاری رکھنا چاہیے۔ خطرات و خدشات سے گھبرا کر ترکِ سفر کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ محنت کرے اور محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تھکاوٹ سے اُسے حوصلے نہیں ہارنے چاہییں۔ پیہم محنت ہی انسان کے لیے کامیابی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور بغیر محنت کے انسان کو کوئی جوہرِ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ بقول سید مستقیم ہمدم نوشاہی:

سفر پاؤں کے چھالے مانگتا ہے ــــ نہیں آسان منزل تک رسائی

دورانِ سفر اگر انسان ٹھہر جائے اور آرام و سکون کے حصول کے لیے قیام کرے تو یقیناً اس سے وقت ضائع ہوتا ہے اور منزل بھی دیر سے ملے گی گویا منزل پر پہنچنا بھی اس کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ بقول نوید صدیقی:

سفر اک اور رستے پر دوبارا کر لیا جائے ــــ نشاں منزل کا کھو جائے تو رک جانے سے بہتر ہے

شاعر نے اس شعر میں مستقل مزاجی کا درس دیا ہے کہ اگر چل چل کر پاؤں تھک جائیں تو ہرگز نہیں ٹھہرنا چاہیے بلکہ کسی نہ کسی طریقے سے سفر جاری رکھنا چاہیے۔ راہ کانٹوں سے پُر ہو تو پھر بھی سفر جاری رکھنا چاہیے۔ اسی طرح منزلِ مقصود کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

غزل نمبر 2

شعر 1

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

(بہاول پور 2008، ملتان 2007 لاہور 2009)

حل لغت: آرزو: تمنا، خواہش — گل: پھول، گلاب کے پھول — روبرو: سامنے

بے تاب: بے چین

مفہوم: اے محبوب! میری یہ آرزو تھی کہ تمھیں پھول کے سامنے کرتے اور پھر میں اور بے چین بلبل آپس میں بات چیت کرتے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر مکمل طور پر مجازی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یہ شعر دوہرا مفہوم ادا کر سکتا ہے۔ پہلے ہم اولین پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ہماری شاعری میں عاشق مظلوم، مجبور اور مقہور ہو کر سامنے آیا ہے۔ جب کہ محبوب ظالم، جابر اور قاہر بن کر سامنے آیا ہے۔ عاشق دل و جان سے اپنے محبوب کو چاہتا ہے لیکن محبوب ہے کہ عاشق صادق کے جذبات مجروح کرتا رہتا ہے۔ عاشق ہجر و فراق کی آتش کی نذر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن محبوب کو چنداں احساس نہیں ہوتا۔ مزید برآں محبوب عہد شکنی بھی کرتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے عاشق اکثر محبوب سے نالاں رہتا ہے۔ بقول جاوید انجم لائل پوری:

ہمیں محبت میں خوں رُلا کر — بتاؤ سرکار کیا ملے گا

بلبل کا بھی تقریباً یہی حال ہوتا ہے۔ بلبل گلاب کے پھول کا عاشق ہوتا ہے۔ عاشقانہ صفات اُس کے اندر رچی ہوئی ہوتی ہیں۔ چناں چہ آتش کی چشم تخیل کو ایک عجیب ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کاش ایسا ہو سکتا کہ میں محبوب کو گلاب کے پھول کے سامنے لے جاتا اور پھر ہم دونوں یعنی میں اور بلبل اپنے اپنے محبوب کے رویوں پر باہم بات چیت کرتے۔ بلبل جو گلاب کے پھول کا عاشق ہوتا ہے وہ اپنے دکھڑے بیان کرتا جب کہ میں اپنے مصائب بیان کرتا۔ ہم دونوں ہی راہِ عشق کے مسافر ہیں اور اس راہِ پُر خار کے متعلق باہم تبصرے کرنے سے شاید ہم دونوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکتا۔ ایک اور شاعر نے بھی اسی طرح کی خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

شعر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر نے تشریح طلب شعر میں محبوب کے حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہو۔ شاعر اپنے محبوب کو حسن و رعنائی کا منفرد پیکر ثابت کرنے کے لیے مبالغہ آمیز انداز میں کہتا ہے کہ میری یہ آرزو تھی کہ محبوب کو گل کے سامنے لے جا کر بلبل کے ساتھ مکالمہ کرتا اور اس سے اپنے محبوب کی خوبصورتی کا لوہا منواتا، پھول اور میرے محبوب کو سامنے رکھ کر اُسے یہ فیصلہ دینا پڑتا کہ واقعی پھول سے کہیں حسین تیرا محبوب ہے۔ اور بلبل بھی پھول کو چھوڑ کر میرے محبوب کا قصیدہ خواں بن جاتا۔ بقول شاعر:

ترے جمال کی رنگینیاں ارے توبہ — بہار دیکھ کے تیرا شباب جلتی ہے

ایک اور شاعر محبوب کی خوبروئی کے متعلق یوں رقمطراز ہے۔

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے — اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر عاشق کو اپنا محبوب دنیا کا سب سے حسین ترین پیکر دکھائی دیتا ہے۔ مجنوں کو لیلیٰ سب سے زیادہ

خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ حالاں کہ لیلیٰ کالی تھی۔ لیکن مجنوں کہتا تھا اسے میری نظر سے دیکھو۔ بقول شاعر:

پھر اس کے بعد کیا دیکھے گا کوئی اسے دیکھے کوئی میری نظر سے

فرہاد شیریں کا عاشق تھا۔ کہتا تھا کہ شیریں جیسی حسین نہ کسی ماں نے جنی ہے نہ جنے گی۔ گو کہ یہ اُس کی خام خیالی تھی لیکن اُس کے خیال میں واقعی وہ کائنات کی حسین ترین نسوانی پیکر تھی۔ اور کچھ اسی طرح کے نظریہ کا آتش نے پرچار کیا ہے۔

شعر 2

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

(بہاول پور 2008، ملتان 2007 ملتان 2010، لاہور بورڈ 2013ء)

حل لغت:

پیام بر: پیغام لے کر جانے والا میسر ہونا: ملنا خوب ہوا: اچھا ہوا

زبانِ غیر: دوسرے کی زبان شرح: تفصیل اور وضاحت

مفہوم:

نامہ بر ہمیں نہیں ملا تو یہ بھی بہتر ہوا کیوں کہ کسی دوسرے کی زبان سے توضیح وتشریح کی توقع نہیں کی جاسکتی

تشریح:

ایک عاشق کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل کا حال خود اپنی زبانی محبوب کو سنائے۔ کیوں کہ انسان اپنے دلی جذبات کو خود موثر انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ بقول شاعر

قاصد کے بیان کا اے امجد کیوں کر ہو اثر ان کے دل پر جس درد سے تم خود کہتے ہو اس طرز بیاں سے کون کہے

دراصل محبوب سے ملاقات بہت مشکل کام ہوتا ہے کیوں کہ محبوب کبھی بھی ملاقات کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ چناں چہ وہ مجبور ہو کر خط کا سہارا لیتا ہے تا کہ اس کی حالتِ زار اور جذبات واحساسات محبوب تک پہنچ جائیں۔ چناں چہ آتش کہتے ہیں کہ انھوں نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ اپنے جذبات واحساسات محبوب تک پہنچائیں اور اس مقصد کے لیے کسی تیسرے شخص یعنی قاصد کی خدمات حاصل کریں۔ شدید جذبات اور ہیجانی کیفیت کی رو میں ایک شخص بعض اوقات غلط فیصلہ بھی کر لیتا ہے۔

کچھ یہی حال شاعر کے ساتھ بھی ہوا۔ جذبات واحساسات کی منجدھار میں الجھ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ نامہ بر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ لیکن اُس کا پیغام محبوب تک پہنچانے کے لیے کوئی شخص آمادہ نہ ہوا۔ گویا اسے کوئی قاصد نہ ملا۔ جذبات واحساسات جب کچھ کم ہوئے اور اُس نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ جلد بازی اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے قاصد کی مداخلت کا انتہائی غلط قدم اٹھایا تھا۔ اور اچھا ہی ہوا کہ قاصد نہ مل سکا۔ بقول شاعر:

کہیں وہ آپ مل جاتا تو اس سے اپنا دکھ کہتے کہا جاتا نہیں ہے حالِ دل خط کی زبانی بھی

کیوں کہ قاصد عاشق کا پیغام، اُس کے جذبات واحساسات کی ترجمانی سے قاصر ہوتا ہے اور جذبات واحساسات کو راہ عشق کے مسافر ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ کسی تیسرے عام شخص میں یہ صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ مزید برآں نظریں اور چہرے بھی جذبات واحساسات کے ترجمان ہوتے ہیں جب کہ قاصد عاشق کے جذبات سے معمور اور احساسات سے بھرپور پیغام پہنچانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اکثر شعرا نے اس کام کو قاصد کے بس کا روگ قرار نہیں دیا۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

نامہ بر یار کے آنے کی نہیں کہتا ایک بھی بات ٹھکانے کی نہیں کہتا

شعر 3

مری طرح سے، مہ و مہر بھی ہیں آوارہ کسی حبیب کی، یہ بھی ہیں جستجو کرتے

(بہاول پور 2008، ملتان 10، 07 راولپنڈی 2006، لاہور بورڈ 2013ء)

حل لغت: مہ و مہر: چاند اور سورج　　جستجو: تلاش　حبیب: محبوب

مفہوم: شاید میری طرح چاند اور سورج بھی کسی محبوب کے متلاشی ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی کسی عاشق کی مانند آوارہ گرد ہیں۔

تشریح:

آوارہ گردی، کوچہ گردی، مارے مارے پھرنا اور دربدری یہ عاشقوں کی صفات ہیں۔ انسان میں جب عشق کا جذبہ سما جاتا ہے تو پھر جذبات کی ندی اُس میں رواں ہو جاتی ہے اور پھر جب جذبات عروج پر پہنچتے ہیں تو عاشق اپنے گھر بار کو چھوڑ دیتا ہے اور گلی کوچے میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بے چینی اور بے قراری کی حالت میں وہ گلیوں کی خاک چھانتا رہتا ہے۔ اور نگر نگر میں دیوانہ پھرتا رہتا ہے تاکہ اُسے محبوب کا دیدار ہو جائے اور اُسے قلبی و ذہنی سکون حاصل ہو جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب جذبہ محبت اور عشق و جنون کی سرحدوں کو پار کرتا ہے تو پھر وہ گلیوں اور کوچوں کو چھوڑ کر صحراؤں اور جنگلوں میں نکل جاتا ہے اور محبوب کو پکارتا رہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس صحرا میں اسے محبوب نہیں مل سکتا۔ چناں چہ اس آوارہ گردی کے عالم میں وہ تمام گری پڑی اور مدار میں گھومتی ہوئی اشیا کو اپنی طرح محبوب کی خاطر آوارہ گرد سمجھتا ہے اور کہنے لگتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا　　اُس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے

تشریح طلب شعر میں شاعر نے بھی ایک آوارہ گرد عاشق کی طرح مہ و مہر کو آوارہ قرار دیا ہے۔ شاعر نے آسمان کے دو عظیم اجرام فلکی کو محبوب کا متلاشی قرار دیا ہے۔ چاند اور سورج کی گردش قواعد فطرت کے مطابق ہے اور اس امر کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ یٰسین میں اظہار بھی فرمایا ہے کہ چاند و سورج سب مقرر شدہ مدار میں گردش کرتے ہیں۔ لیکن شاعر نے صنعت حسن تعلیل کا استعمال کرتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سورج، چاند محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ محبوب ان کی تلاش کا محور ہے۔ بالکل عاشقوں کی طرح یہ بھی وفور جذبات سے سرشار ہو کر محبوب کے متلاشی ہیں۔ بقول شاعر:

؎ یہ بے جواز نہیں مہر و ماہ کی گردش　　کسی کی چاہ انھیں دربدر پھراتی ہے

؎ رہتے ہیں سدا چاند بھی، سورج بھی سفر میں　　شاید کسی محبوب کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں

داخلی لحاظ سے حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس شعر کو نظریہ وحدۃ الوجود کے اعتبار سے بھی پرکھ سکتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق خدا کل ہے اور کائنات جزو ہے اور جزو اپنے کل سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ لہذا سورج اور چاند جزو ہیں اور اپنے محبوب (خدا) جو کہ کل ہے کو دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اور اللہ سے محبت کرنے والے بھی خدا کے دیدار کے متلاشی رہتے ہیں۔

شعر 4:

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا　　تمام عمر رفوگر رہے، رفو کرتے

(ملتان 2010 لاہور 2009)

حل لغت: رفو کرنا: مرمت کرنا　رفوگر: کپڑے کی مرمت کرنے والا، یہاں مراد ہے، ہم درد، خیر خواہ

مفہوم: میں جنون اور عشق میں اپنے گریباں کو چاک کرتا رہا جب کہ میرے دوست اسے مرمت کرتے رہے

تشریح:

عشاق جب جنون کی حدوں کو پار کرتے ہیں اور عشق میں فنافی المحبوب کے مقام تک پہنچتے ہیں تو گھر بار، اعزہ و اقارب کو چھوڑ کر

صحراؤں کا رخ کرتے ہیں۔ عالم وحشت اور حالت جنون میں اپنے گریباں اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالتے ہیں۔ بد وضعی ان عشاق کی ایک وضع داری ہوتی ہے۔ پھٹے کپڑوں اور مشکل حالات میں رہنا انھیں پسند ہوتا ہے۔ لیکن ان کی اس دیوانگی سے بچے محظوظ ہوتے ہیں اور بعض شر پسند تو پتھراؤ سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر گھر والوں کو ترس آتا ہے اور عاشق کو مظلوم جان کر زبردستی گھر میں لا کر مقید کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سعی لاحاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ جنون کے سامنے شمشیریں اور تدبیریں بلکہ زنجیریں بھی ناقص ثابت ہوتی ہیں۔

جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

چناں چہ عاشق پھر جنگلوں اور صحراؤں کا رخ کرتا ہے اور اپنا مرمت شدہ گریباں پھر چاک کر دیتا ہے۔ شاید اسی لیے عاشق کے مقدر میں آنے والے گریباں کو مرزا اسد اللہ خان غالب نے مظلوم قرار دیا۔ کہتے ہیں کہ:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تشریح طلب شعر میں آتش نے اسی نکتے کے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سکونِ قلب برباد ہوتا ہے۔ تو میں اپنا گریباں جنون کے عالم میں پھاڑ ڈالتا ہوں۔ ہیجانی کیفیت میں مجھے گریباں پھاڑنے سے بھی سکون محسوس ہوتا ہے۔ تاہم میرے احباب یہ منظر دیکھ کر ترس کھاتے ہیں۔ میرے ہم درد پھٹا ہوا گریباں دیکھ کر اسے مرمت کر دیتے ہیں۔ غم خوار دوست پھٹے ہوئے گریباں کو رفو کر دیتے ہیں۔ تاہم اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اگلے ہی لمحے جب جنون طاری ہوتا ہے۔ تو رفو شدہ گریباں پھر ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن دوستوں نے بھی شاید مکمل طور پر ہم دردی کی قسم اٹھائی ہوئی تھی۔ میں گریباں کو پھاڑتا رہتا ہوں جب کہ وہ اسے مرمت کرتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ میرا پاگل پن ہے۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ جب قلب میں عشق کی چنگاری سلگتی ہے تو انسان کیسی وضع پسند کرتا ہے۔ بہر صورت میں نے گریباں کو پھاڑنا اپنا وطیرہ بنائے رکھا اور انھوں نے اسے مرمت کرنا جاری رکھا اور تمام عمر یہی سلسلہ جاری رہا۔ بقول شاعر:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر 5:

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

حل لغت:

عالم: کیفیت، حالت — برگشتہ: ناراض — طالع: قسمت کی — برگشتہ طالعی: بد نصیبی
عالم برگشتہ: خراب قسمت کی حالت — باراں: بارش

مفہوم:

اے آتش! ہماری خراب قسمت کی حالت مت پوچھو، ہم تو وہ لوگ ہیں کہ بارش کی آرزو کریں تو آسمان سے آگ برسنے لگتی ہے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے اپنی بد نصیبی کا مضمون باندھا ہے۔ آتش کے اشعار میں رجائیت اور قنوطیت دونوں ملتے ہیں۔ زیر تشریح شعر ان کے قنوطی ہونے کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی بد قسمتی کے متعلق کہتے ہیں کہ ہمارا مقدر ہی الٹا ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں تقدیر ہمیشہ اس سے الٹ چلتی ہے۔ سکون طلب کریں تو بے سکونی۔ آرام طلب کریں تو تھکاوٹ۔ راحت کی بجائے کلفت۔ مقدر ہی کے متعلق ایک اور شاعر نے بیان کیا:

مقدر میں جو سختی تھی وہ مر کر بھی نہیں نکلی
لحد کھودی گئی میری تو پتھریلی زمیں نکلی

آتش کہتے ہیں کہ اگر مصائب وحالات سے تنگ ہو کر وہ برسات کی تمنا کریں کہ تو کچھ ہی دیر بعد انگاروں کی بارش شروع ہو جائے گی اور فلک ہم پر آگ برسانا شروع کر دے گا۔ گویا ناکامی ونامرادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی　　مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

حل مشق

1۔ پہلی غزل میں ''راہ میں ہے'' ردیف ہے۔ آتش کی دوسری غزل میں ''ردیف'' کی نشاندہی کریں۔

''کرتے'' ردیف ہے۔

2۔ شامل نصاب آتش کی غزلوں کو پیش نظر رکھ کر نیچے دیے گئے ہر سوال کے درست جواب پر صحیح (✓) کا نشان لگائیں۔

ا۔ مسافر نواز کسے کہا گیا ہے؟　(الف) رہبر قافلہ کو　✓ (ب) شجر سایہ دار کو

(ج) سامان سفر کو　(د) منزل مقصود کو

۲۔ ''عدم کے کوچ'' سے کیا مراد ہے؟

✓ (الف) دوسری دنیا کا سفر　(ب) زندگی کا سفر　(ج) عام سفر　(د) نجی سفر

۳۔ بدرقہ اور رفیق ساتھ نہ ہو تو کون کام آتا ہے؟

(الف) اپنی ہمت　(ب) اپنی ذات　(ج) سامان سفر　✓ (د) عنائیت پروردگار

3۔ مختصر جواب دیں۔

سوال ۱۔ آتش کی وجہ شہرت کیا ہے۔

جواب　غزل گوئی

سوال ۲۔ آتش کی دوسری غزل کے قافیے ترتیب وار لکھیں۔

جواب　روبرو۔ گفتگو۔ آرزو۔ جستجو۔ رفو۔ آرزو

سوال ۳۔ دوسری غزل کے مقطع کو پیش نظر رکھ کر بتائیں کہ آتش اپنی قسمت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

جواب　شاعر کے مطابق ان کی قسمت بہت خراب ہے کہ اگر پانی کی آرزو کریں تو برسات آگ برسنا شروع ہو جائے

سوال ۴۔ اس غزل کے مطلع میں آتش نے کیا آرزو کی ہے۔

جواب　شاعر نے آرزو کی ہے کہ کاش وہ محبوب کو گل کے سامنے کر کے بلبل سے بات چیت کرتے تا کہ باہم دکھ بانٹتے اور محبوب کے حسن کا لوہا منواتے۔

سوال 4۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کریں۔

الفاظ		معنی
مسافر نواز	:	مسافروں پر مہربانی کرنے والے۔ مسافروں کے مددگار
زبان غیر	:	دوسرے کی زبان
ہوائے دور مئے خوش گوار		لذیذ شراب کی مہک آلود ہوا
گل مراد		تمنا کا پھول
بدرقہ		رہنما، محافظ، نگہبان